

جمہوریت یا اسلام؟

فرقہ اہل حدیث کے ترجمان، ماہنامہ محدث (لاہور) نے (جنوری۔ فروری ۱۹۸۱ء) کا ایک خاص نمبر شائع کیا ہے جس کا عنوان ہے ”جمہوریت یا اسلام“۔ اس میں سے چند ایک چیدہ چیدہ نکات پیش رفتہ قارئین کے جانتے ہیں جو گہرے غور و تدبر کے متقاضی ہیں۔

۱) قانون سازی کا اختیار

نظام خلافت میں مقتدر اعلیٰ خود اللہ تعالیٰ ہے۔ وہی ہر چیز کا مالک اور وہی قانون ساز ہے۔ ملت اسلام اور انسانیت کی فلاح و بہبود کے لئے نبی و پیغمبر اللہ تعالیٰ خود بخود انبیاء و انسانوں کو بتلاتا ہے۔ ایسی قانون سازی کا اختیار کسی نبی کو بھی نہیں ہوتا۔ (صفحہ ۱۹۹)

(ب) اسلامی نقطہ نظر سے کسی فرد کو یا ادارہ کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ خدائی قوانین میں ترمیم و تنسیخ کر سکے..... اللہ تعالیٰ ہی قانون ساز ہے۔ کسی دوسرے کو قانون سازی کا اختیار حاصل نہیں۔ اور نہ خدا کے بنائے ہوئے قانون میں رد و بدل کر سکتا ہے۔ حتیٰ کہ نبی بھی ایسا نہیں کر سکتا۔ (صفحہ ۲)

(ج) اس معاشرہ کا حکمران کوئی مطلق العنان یا مقتدر اعلیٰ شخصیت نہیں ہوتی بلکہ قانونی لحاظ سے وہ عام آدمی کی سطح پر ہی ہوتا ہے۔ اس کی حکمرانی صرف ان معنوں میں ہے کہ وہ خدائی قوانین کی مشترکہ اطاعت کے لئے طریق کار وضع کرے۔ (صفحہ ۲)

آپ ان الفاظ پر بار بار غور کیجئے کہ

قانون سازی کا اختیار صرف خدا کو حاصل ہے۔ کسی انسان کو نہیں۔ حتیٰ کہ نبی کو بھی نہیں۔ کوئی انسان خدا کے قوانین میں رد و بدل نہیں کر سکتا۔ حتیٰ کہ نبی بھی ایسا نہیں کر سکتا۔

اگر ہم شروع میں یہ نہ بتاتے کہ یہ اقتباسات کہاں سے لئے گئے ہیں تو یقیناً آپ یہی سمجھتے کہ یہ طلوع اسلام کے کسی مقالہ کے اقتباسات ہیں۔ لیکن تا شاید یہ ہے کہ اگر طلوع اسلام یہی کہے تو منکر حدیث، منکر سنت اور منکر رسالت (فالہذا المحدث و بے دین) قرار پائے، اور انہی معتقدات کا اظہار، محدث کرے تو حامی حدیث و سنت ٹھہرے!

بہر حال، ہم مؤقر جریدہ محدث کو اس اظہارِ حق پرستی مبارک باد قرار دیتے ہیں۔ اس سے واضح ہو گیا کہ ان حضرات کے نزدیک بھی (اسلام میں ضابطہ قوانین، قرآن مجید ہے اور اس میں کسی قسم کے تغیر و تبدل کا حق (فقہاء و ایک طرف) حضور نبی اکرم کو بھی حاصل نہیں تھا۔ اس سے کتاب و سنت کا مسئلہ بھی حل ہو گیا۔ (خود ان حضرات کے عقیدہ یا اعتقاد کے مطابق) سنت کی رو سے نہ تو قرآنی قوانین میں کسی قسم کا اضافہ ہو سکتا ہے، کیونکہ قانون سازی کا حق صرف خدا کو حاصل ہے۔ اور نہ ہی رد و بدل۔
فالحمد للہ علیٰ ذلک۔

(۱)

۲۔ عبادت کا ترجمہ

طلوع اسلام نے، لفظ عبادت کا ترجمہ، اطاعت یا محکومیت کیا تو شور مچا دیا گیا کہ یہ خدا کی پرستش کا منکر ہے۔ زیرِ نظر محدث اس باب میں لکھتا ہے:-

ملوکیت میں ایک انسان کی غلامی ہوتی ہے۔ جمہوریت میں پارلیمنٹ کی۔ اس طرح دوسرے نظام ہائے حکمرانی میں جو فرد یا ادارہ مقتدرِ اعلیٰ ہوگا، وہ حاکم اور عوام یا رعایا اس کی غلام ہوگی..... خلافت میں امیر اور رعایا پر ایک ہی قانون نافذ ہوتا ہے۔ دونوں اللہ کے بندے اور غلام ہوتے ہیں۔ کوئی انسان کسی حاکم یا ادارے یا دوسرے انسان کا غلام نہیں ہوتا۔ حضور نبی اکرم نے اہلِ مہجران کے نام جو نامہ مبارک لکھا تھا، اس میں درجِ ذیل الفاظ قابلِ غور ہیں۔
..... اذما بعد خانی ادعوکم الی عبادۃ اللہ من عبادۃ العباد.....

اذان بعد تمہیں بندوں کی غلامی سے نجات دلا کر اللہ کی غلامی اور عبدیت کی طرف بلاتا

ہوں۔ (صفحہ ۲۱۰)

آپ نے دیکھا کہ عبادت کا مفہوم غلامی یا محکومی بنایا گیا ہے، نہ کہ پرستش۔ اگر یہ حضرات عبادت کے اس مفہوم پر تکیہ نہ کریں تو کتنے الجھاؤ و دُور ہو جائیں۔ غیر قرآنی نظام میں "خدا کی عبادت کا تصور اور امکان ہی نہ رہے! آسمان پر ہم تحریک پاکستان کے دوران، ان حضرات سے کہتے تھے کہ متیرہ ہندوستان میں، مسلمانوں کے لئے "خدا کی عبادت" کا امکان ہی نہیں۔ وہاں "خدا کی پرستش" ہو سکے گی۔ عبادت (محکومیت) نہیں۔ عبادت کے مفہوم کے اس فرق سے دین، مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ مذہب میں خدا کی پرستش ہوتی ہے۔ دین میں اس کی محکومیت۔ سیکولرزم میں خدا کی پرستش کی آزادی مل سکتی ہے۔ خدا کی محکومیت کی نہیں۔

(۲)

۳۔ مشاورت

ہم شروع سے اس حقیقت کو پیش کرتے چلے آ رہے ہیں کہ قرآن کریم کے بنیادی اصولوں (اساسی قوانین و حدود)

کی جزئیات (یعنی وہ طور طریق جن کے مطابق ان قوانین پر عمل کیا جائے گا) اسلامی مکت، امت کے مشورہ سے متعین کرے گی۔ محدث میں اس موضوع پر تفصیلی بحث کی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ خود حضور نبی اکرم نے بھی یہی طریق اختیار کیا تھا کہ ایسا کرنے کے لئے آپ کو خود خدا نے حکم دیا تھا۔ چنانچہ محدث میں، اس قسم کی کئی ایک مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ مثلاً:-

(۱) جنگ بدر کے قیدیوں کا معاملہ۔

(۲) اذان کا تعین۔

(۳) مشاورت متعلقہ غزوہ احد۔ (صفحہ ۱۳۶-۱۳۷)

اسی طرح، خلافت راشدہ کے نظائر کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ محدث کے اس اعتراف سے ایک ایسی بنیادی مسئلہ کا حل مل جاتا ہے جو شروع سے امت میں مابہ النزاع چلا آ رہا ہے اور جسے دین کی اساس قرار دیا جاتا ہے۔ اہل حدیث حضرات سورہ النجم کی آیات وَمَا يَنْطَلِقُ الْإِنْشَاءُ إِلَّا مِنْ رُوحٍ قَدُوسٍ (سہ ۳۵) کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ رسول اللہ کا ہر قول (اور عمل) وحی کی بنا پر ہوتا تھا۔ اسی سے ان کا عقیدہ ہے کہ ایک وحی قرآن کریم میں درج ہے اور دوسری وحی احادیث میں، ان دونوں میں کوئی فرق نہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر حضور کا ہر قول وحی پر مبنی ہوتا تھا تو آپ صحابہؓ سے مشورہ کیوں کیا کرتے تھے؟ ظاہر ہے کہ جو معاملہ مشورہ کے بعد طے ہوتا تھا، وہ وحی خداوندی نہیں ہوتا تھا۔ حضور کی مشاورت سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ وحی خداوندی صرف قرآن کے اندر تھی اور اس وحی پر عمل درآمد باہمی مشاورت سے ہوتا تھا جس میں بعض اوقات فیصلہ خود حضور کی رائے کے بھی خلاف طے پاتا تھا۔

اور یہ بھی واضح ہے کہ جو معاملات مشورہ سے طے پائیں، وہ ابدی اور غیر متبدل نہیں ہو سکتے۔ اس سے احادیث کی پوزیشن واضح ہو جاتی ہے۔ اسی بنا پر امام ابوحنیفہؒ ارشاد فرمایا کرتے تھے کہ

رسول اللہ کا طریقہ یہ تھا کہ آپ تعین جزئیات (تدوین فقہ) میں صحابہؓ سے مشورہ لیا کرتے تھے۔ اور جس کی رائے بہتر معلوم ہوتی، اسے اختیار فرمایا کرتے تھے۔ اگر میں بھی رسول اللہ کے زمانے میں ہوتا تو اس مجلس مشاورت میں شریک ہوتا۔ اور میرا خیال ہے کہ کئی امور میں حضور میری رائے کو اختیار فرمالیتے۔ (آپ فرماتے کہ) میں اس کے سوا کیا ہے کہ وہ اچھی اور عمدہ رائے کا نام ہے۔

(تاریخ خطیب بغدادی، جلد ۱۳، صفحات ۳۹۰-۳۸۷)

اور اسی سے فقہی قوانین کی پوزیشن بھی واضح ہو جاتی ہے۔ یعنی ابدی اور غیر متغیر صرف قرآن کے احکام و قوانین ہیں۔ حدیث ہو یا فقہ کسی کی حیثیت نہیں۔ قرآنی احکام و اصول اور امت کی مشاورت۔ یہ ہے اسلامی نظام!

مشاورت کی اہمیت

امت کی مشاورت کی اہمیت کے متعلق، محدث نے دو ایک نہایت اہم احوال درج کئے ہیں۔ (مثلاً)

(۱) حضرت عمرؓ کا ارشاد ہے کہ لا خلافت الا عن مشورۃ۔ مشاورت کے بغیر خلافت نہیں۔
(۸۳)

حضرت ابو موسیٰ اشعرمی کا بیان ہے۔
امارت وہ ہے جسے قائم کرنے میں مشورہ کیا گیا ہو اور بادشاہی وہ ہے جس پر تلوار کے زور سے قبضہ حاصل کیا گیا ہو۔ (۸۴)
محدث نے، بخاری کے حوالے سے، حضرت ابو بکر صدیقؓ کی بیعت خلافت کی روئے ادب پر تفصیل سے لکھی ہے۔
اس میں حضرت عمرؓ کا یہ قول نمایاں طور پر درج کیا گیا ہے کہ
جس کسی نے مسلمانوں کے مشورہ کے بغیر کسی کی بیعت کی تو بیعت کرنے والا اور جس کی بیعت کی گئی، دونوں کو قتل کر دیا جائے گا اور (پھر فرمایا) دیکھو! میں پھر... یہی کہتا ہوں کہ جو شخص مسلمانوں کے مشورہ کے بغیر کسی کی بیعت کرے تو دوسرے لوگ، اس کی پیروی نہ کریں، نہ اس کی جس کی بیعت کی گئی۔ کیونکہ دونوں اپنی جانیں گنوا بیٹھیں گے۔ (مسند ۲۲)
یہ ہے اسلامی مملکت اور اسلامی نظام کی اصل اور بنیاد۔ یہ اس لئے کہ قرآن کریم کی رو سے، مملکت کسی خاص فرد کو نہیں، پوری کی پوری امت کو دی جاتی ہے۔ لہذا، اقتدار اسی کو مل سکتا ہے جسے امت باہمی مشاورت سے اس کی اہل سمجھے۔

(۱)

وحدت امت

اسلام ایک اجتماعی نظام زندگی قائم کرتا ہے۔ یہ نظام جس قوم کے فہم و فہم قائم ہوتا ہے، وہ اسے امت تعمیر کرتا ہے۔ چونکہ اس امت کے تمام افراد کے لئے ایک ہی نظام ہوتا ہے اس لئے امت کی وحدت بھی اس کی لازمی شرط ہے۔ غلہذا، وحدت نظام اور وحدت امت لازم و ملزوم ہیں۔ اگر امت میں افتراق و انتشار پیدا ہو جائے تو وہ نظام بھی باقی نہیں رہتا۔ یا یوں کہیے کہ جب وہ نظام باقی نہ رہے تو امت کی وحدت بھی ختم ہو جاتی ہے۔ پھر اس میں فرقے پیدا ہو جاتے ہیں۔ ارشادات نبویؐ میں اسے تمسک بالجماعت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ قرآن کریم میں ارشاد ہے: **وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللَّهِ جَمِيعًا وَلَا تَفَرَّقُوا...** (۲/۱۷۱)
اے جماعت مومنین۔ تم سب مل کر۔ اجتماعی طور پر، خدا کی کتاب کے ساتھ تمسک رہنا اور فرقوں میں نہ بٹ جانا۔ جماعت، اسی جیتا کی شکل کا نام ہے۔ محدث نے "بلی وحدت" کے عنوان سے، تمسک بالجماعت کی اہمیت پر تفصیل طور پر گفتگو کی ہے۔ اس نے لکھا ہے۔

رفی وحدت میں عناصر سے عبارت ہے: جماعت۔ امیر اور فرد۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:
لا اسلام الا بالجماعة، ولا جماعة الا بالامین، ولا امین الا بالسمع والاطاعة۔
جماعت کے بغیر اسلام کی سر بندی ناممکن ہے اور امیر کے بغیر جماعت متحد نہیں رہ سکتی اور امیر

کی امارت اس وقت تک بار آور نہیں ہو سکتی جب تک کہ شخص اس کا حکم سن کر اس کی بات نہ مانے۔
اب اس ملی وحدت کو برقرار رکھنے کے لئے ارشادات نبویؐ ملاحظہ فرمائیے۔

ملت اسلامیکہ کا خلیفہ ایک ہی شخص ہو سکتا ہے۔ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اِذَا يُوْبِيعُ الْخُلَيْفَتَيْنِ فَاَقْتُلُوا الْاٰخِرَ مِنْهُمَا۔ (مسلم، کتاب الامارۃ والقضاء)

جب دو خلیفوں کی بیعت ہونے لگے تو بعد والے کو قتل کر دو۔

اور فقہائے اُمت کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ اگر ایک ہی وقت (بغیر تقدیم و تاخیر) دو خلیفوں

کا انتخاب واقع ہو تو دونوں کا انتخاب کا عدم قرار پاسٹے گا اور نئے سرے سے خلیفہ کا

انتخاب ہوگا۔

امیر کی اطاعت و جماعت و ابستگی | ارشاد باری ہے:-
اَطِيعُوا اللّٰهَ وَاَطِيعُوا الرَّسُوْلَ وَاَطِيعُوا

اَوَّلِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ۔ (۴۹)

اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔ پھر حاکموں کی جو تم میں سے ہوں۔

• اولی الامر سے خلیفہ کے علاوہ وہ دوسرے تمام حکام بھی مراد ہیں جو شورعی انتظامیہ یا عدلیہ

سے تعلق رکھتے ہیں۔

طلوع اسلام اس آیت (اَطِيعُوا اللّٰهَ وَاَطِيعُوا الرَّسُوْلَ وَاَطِيعُوا اَوَّلِي الْاَمْرِ مِنْكُمْ) کا مفہوم یہ پیش

کرنا چلا آرہا ہے کہ "اطاعت خدا و رسول" سے مراد اسلامی مملکت کی مرکزی اتھارٹی کی اطاعت ہے جو نظام

خداوندی کے قائم کرنے کی ذمہ دار ہے، اور اولی الامر منکم کی اطاعت سے مراد اس مرکزی حکومت

کے مقرر کردہ، ماتحت عمال کی اطاعت۔ ہماری مذہبی پیشوائیت کی طرف سے، اس مفہوم کی مخالفت

ہوتی تھی۔ ان کے نزدیک اولی الامر سے مراد علماء و حضرات ہیں جو "امر بالمعروف اور نہی عن المنکر"

کے فریضہ کی ادائیگی کے ذمہ دار ہیں۔ غنیمت ہے کہ محدث نے اس محکمہ مفہوم نہیں لیا اور کہا ہے

کہ اس سے مراد، شورعی، انتظامیہ، عدلیہ سے تعلق رکھنے والے حکام ہیں۔ لیکن اس میں.....

پھر ایک الجھاؤ پیدا کر دیا گیا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ

اولی الامر سے خلیفہ کے علاوہ، وہ دوسرے تمام حکام بھی مراد ہیں جو شورعی، انتظامیہ

یا عدلیہ سے تعلق رکھتے ہیں۔

رسول اللہؐ کی زندگی میں تو خلیفہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لئے محدث کا پیش کردہ

یہ مفہوم کہ اولی الامر سے خلیفہ اور اس کے علاوہ دیگر حکام مراد ہیں، اس نظام پر صادق نہیں آ سکتا

جس کے سربراہ حضورؐ تھے۔ اب رہ حضورؐ کے بعد اسلامی نظام، سو اگر اس میں خلیفہ بھی اولی الامر

میں شامل تھا، تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ

(۱) خلیفہ کس کا مقرر کردہ ماتحت حاکم تھا؟

(۲) اور اگر خلیفہ ماتحت حکام میں شامل تھا تو اطاعت خدا اور رسولؐ کی عمل شکل کیا تھی؟ کس کی اطاعت؟ خدا اور رسولؐ کی اطاعت متصور ہوتی تھی؟

(۳) اگر خلیفہ کا شمار بھی ماتحت حکام میں ہوتا تھا تو نظام مملکت قائم کس طرح رہ سکتا تھا؟ نظام تو ایک مرکزی اتھارٹی (CENTRAL GOVT.) کا متقاضی ہوتا ہے۔

(۴) خلفائے راشدین مرکزی اتھارٹی کی حیثیت رکھتے تھے یا ماتحت حکام کی؟

اصل یہ ہے کہ ہمارے یہ قدامت پرست حضرات آجکل عجیب شناس میں گرفتار ہیں۔ اسلام کے متعلق قدم تصورات ان کے قلب کی گہرائیوں میں پیوست ہیں۔ لیکن وہ تصورات عملاً اسلامی نظام میں فٹ نہیں بیٹھتے۔ یہ حضرات ان تصورات سے انکار بھی نہیں کر سکتے اور یہ کہنے کی بجائے نہیں رکھتے کہ ان تصورات کی رُو سے اسلامی نظام کا قیام ناممکنات میں سے ہے۔ وہ..... قدامت پرستی اور ماڈرنزم کے بین میں رہنا چاہتے ہیں لیکن ایسا ممکن نہیں۔ اس لئے ان کی یہ سعی لا حاصل عجیب مضحکہ انگیز صورت اختیار کر لیتی ہے۔ محدث نے خلیفہ کو اولی الامر (ماتحت حکام) میں شامل کرتے وقت سوچا ہی نہیں کہ اس کا اعلیٰ نتیجہ کیا نکلے گا؟

قرآن کریم کی رُو سے، ”اطیعوا اللہ واطیعوا الرسولؐ“ سے مراد، اسلامی نظام مملکت کی مرکزی اتھارٹی کی اطاعت ہے۔ حضورؐ کی زندگی میں، یہ مرکزی اتھارٹی آپؐ خود تھے۔ حضورؐ کے بعد، حضورؐ کے خلفاء اور اولی الامر سے مراد مرکزی حکومت کے ماتحت حکام ہیں۔ حضورؐ کی زندگی میں بھی، اور حضورؐ کے بعد بھی، یہ نظام قرآن کی بنیادوں پر سرزبانے میں قائم ہو سکتا ہے۔ اس نظام میں مرکزی اتھارٹی کی اطاعت، بمنزلہ اللہ اور رسولؐ کی اطاعت کے ہوگی۔ اور اولی الامر کی اطاعت ماتحت حکام کی اطاعت۔

(۰)

ملی وحدت کے متعلق محدث کی مزید تصریحات ملاحظہ فرمائیے۔ تحریر ہے: ”ملی وحدت کے متعلق اب ارشادات نبویؐ ملاحظہ فرمائیے:-“

(۱) عن ابی ہریرۃ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال من اطاعنی فقد اطاع اللہ ومن عصانی عصی اللہ ومن اطاع امیری فقد اطاعنی ومن عصانی فقد عصانی۔ (بخاری - کتاب الاحکام)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے میری نافرمانی کی اس نے اللہ کی نافرمانی کی۔ اور جس نے میرے مقرر کیے ہوئے حاکم کی اطاعت کی اس نے میری اطاعت کی اور جس نے میرے امیر کی نافرمانی کی اس نے گویا میری نافرمانی کی۔

(۲) عن عبد اللہ بن عمر یقول کنا نبایع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علی السمع والطاعة یقول لنا فیما استطعتم۔

(مسلم - کتاب الامارۃ، باب البیعة علی السمع والطاعة - بخاری)

عبداللہ بن عمرؓ کہتے ہیں۔ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حکم سننے اور فرمانبرداری کرنے کی شرط پر بیعت کرتے تھے۔ آپؐ ہمیں کہتے: اپنی استطاعت کے مطابق (یا مشورہ پر بھرتیس) سمع و طاعت لازم ہے۔

(۳) عن عروذجة قال سمعت رسول الله صلى الله عليه وسلم يقول من اتاكم وامركم جميع على رجل واحد يري ان يشق عصاكم او يفرق جماعتكم فاقتلوه (مسلم، کتاب الامارہ والقضاء)

عرفجہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے اگر تمہارے معاملات کسی ایک شخص پر اکٹھے ہوں پھر کوئی شخص تمہاری قوت کو توڑنے یا تمہاری جماعت میں تفرق ڈالنے کی کوشش کرے تو اسے قتل کر دو۔

(۴) عن ابی ہریرۃ قال قال رسول الله صلى الله عليه وسلم من خرج من اطاعة وفارق الجماعة ثم مات، مات ميتة جاهلية (مسلم، کتاب الامارہ)

ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جو کوئی امیر کی اطاعت سے نکلے، اور جماعت سے الگ ہوا، پھر مر گیا تو وہ جاہلیت کی موت مرا۔

امیر اگر نسل کے لحاظ سے کثیر یا شکل کے لحاظ سے یہ صورت ہو تو بھی اس کی اطاعت بدستور واجب ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

(۵) ان اوتیر علیکم عبد محدث یقر دکم بکتاب الله فاسمعوا له واطيعوا (مسلم، ایضاً)

اگر تم پر نیکو غلام بھی امیر بنادیا جائے تو جب تک وہ تمہیں اللہ کے احکام کے مطابق چلاتا ہے۔ اس کی بات سنو اور اس کی اطاعت کرو۔

ایسے امیر کے احکام کی ہر حال میں — تنگی یا آسانی، وہ احکام رعایا کو پسند ہو یا ناپسند، طاعت واجب ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:۔

(۶) السمع والطاعة على امرئ المسلم فيما احب وكره مالم يؤمر به عصىة واذا امر به عصىة فلاسمع ولاطاعة۔ (متفق علیہ) (بخاری کتاب الاحکام)

”ہر مسلمان پر سننا اور طاعت کرنا لازم ہے خواہ وہ حکم اسے پسند ہو یا ناپسند جب تک کہ وہ گناہ کا حکم نہیں دیتا۔ اور اگر وہ گناہ کا حکم دے تو پھر نہ اس کی بات سنو نہ طاعت کرو۔“

ضمناً۔ ان احادیث میں ”السمع والطاعة“ پر زور دیا گیا ہے۔ قرآن کریم میں بھی ”سمعنا واطعنا“ (۲) (دیگر متعدد مقامات) آیا ہے۔ یعنی احکام کو سننا اور ان کی اطاعت کرنا۔ اس سے واضح ہے کہ اسلامی نظام کے لئے ایک زندہ اقتدار کی موجودگی لاینفک ہے جس کا حکم سنا جائے۔ محض کتابوں میں درج شدہ احکام کی اطاعت سے یہ مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ محدث نے بھی اسے تسلیم کیا ہے جب کہا ہے کہ

ملت اسلامیہ کے لئے امام کے بغیر ایک لمحہ بھی گزارنا ناقابل برداشت ہے۔ (ص ۲۱)
 لیکن "امام" ہر فرد کو نہیں کہا جاسکتا۔ اسلامی نظام اور اس کے امام کی خصوصیات اور امتیازات قرآن کریم میں
 واضح ہیں۔ امت خلافت راشدہ کے بعد آج تک بلا امام چلی آرہی ہے لیکن جو اسلام اس دوران میں رائج تھا
 ہماری مذہبی پیشوا ثنیت اسے صحیح اسلام قرار دے رہی ہے اور اسی کے عملی نفاذ کی اس کو ششیں ہو رہی ہیں۔

(۰)

مذہبی فرقے اور سیاسی پارٹیاں

وحدت امت کی اہمیت سامنے آنے کے بعد، مذہبی فرقوں اور سیاسی پارٹیوں کا سوال لازماً سامنے آنا
 چاہیے تھا۔ جہاں تک مذہبی فرقوں کا تعلق ہے، محدث نے لکھا ہے:-

تیسری لعنت وہ مذہبی فرقے ہیں جو اپنی الگ الگ فقہ کو سینے سے چٹائے ہوئے ہیں اور اس
 بات پر مصر ہیں کہ "کُلُّ جَزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ" (۱) سب فرقے اسی میں خوش
 ہیں جو ان کے پاس ہے۔ "کے مصداق جو کچھ ان کے پاس ہے بس وہی ٹھیک ہے۔ باقی سب غلط
 ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ قرآن تو سب کا ایک ہے۔ اور سنت بھی ایک ہے لیکن فقہ میں چار ہیں
 بلکہ اگر شیعہ حضرات کی فقہ جعفریہ بھی شامل کر دیں تو پانچ ہیں جس کا واضح مطلب یہ ہے کہ
 کوئی بھی فقہ دین کا حصہ نہیں ہے۔ (ص ۲۲)

آپ غور فرمائیے کہ فرقہ پرستی کس قسم کی ذہنیت پیدا کر دیتی ہے! محدث کا کہنا یہ ہے کہ

(۱) اہل فقہ کے فرقے تو لعنت ہیں، لیکن اہل حدیث کا فرقہ لعنت نہیں (کیونکہ یہ خود اس سے متعلق ہیں)۔
 اور "کُلُّ جَزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُونَ" کا اطلاق ان پر ہوتا ہے، ان پر نہیں ہوتا! ہر فرقہ یہی
 کہہ کہ فرقہ پرستی کو مستحکم کرتے رہتا ہے۔ اور یہ قرآن کی تہ سے شرک ہے۔ (۲)

(۲) محدث کا کہنا ہے کہ قرآن سب کا ایک ہے اور سنت بھی ایک ہے۔ ہم اپنے اس معاصر سے پوچھنا
 چاہتے ہیں کہ وہ کونسی کتاب ہے جس میں مندرج "سنت" کو تمام فرقے متفقہ طور پر سنت تسلیم کرتے ہیں؟ حقیقت
 یہ ہے کہ ہر فرقہ اپنے مسلک اور اپنے شرعی احکام کو سنت پر مبنی قرار دیتا ہے۔ سنت کا یہی اختلاف تو تھا جس
 کے پیش نظر مودودی (مرحوم) نے کہا تھا کہ کتاب و سنت کی بنا پر پاکستان میں کوئی ایسا ضابطہ قوانین مرتب
 نہیں ہو سکتا جسے تمام فرقے متفقہ طور پر اسلامی تسلیم کر لیں۔ یہ کہنا کہ سنت سب کی ایک ہے بہت بڑی
 مغالطہ آفرینی ہے۔ زبان سے سب یہی کہتے ہیں اور عملاً ہر ایک اس کی تفسیر کرتا ہے۔ اگر کتاب و سنت ہر ایک
 کی ایک ہی ہے تو آپ شرعی اداروں میں اپنے فرقہ کی الگ نمائندگی کا مطالبہ کیوں کرتے ہیں؟

(۳) ان فرقوں کا اختلاف تو نماز، روزہ وغیرہ احکام کی ادائیگی میں سامنے آتا ہے۔ ہم سے جب پوچھا جاتا
 ہے کہ ان اختلافات کی شکل میں کیا کیا جائے، تو ہمارا جواب یہ ہوتا ہے کہ اس وقت مختلف فرقے جس طرح ان
 کی ادائیگی کر رہے ہیں، ان پر کوئی اعتراض نہ کیا جائے۔ نہ کوئی نیا طریق وضع کیا جائے۔ نہ مزبور طریقوں میں کسی قسم

کا رد و بدل کیا جائے۔ جب کبھی اسلامی مملکت وجود میں آئے گی تو جس شکل کو وہ مقرر کرے گی اس کا اتباع ساری قوم کے لئے لازمی ہوگا۔ یوں یہ اختلافات رفع ہو سکیں گے۔ محدث نے بھی یہی حل بتایا ہے۔ لکھا ہے۔
 اس کا دوسرا حل یہ بھی ہے کہ ایسے فردی مسائل جن میں ہر فرقہ کے پاس اولہ شرعیہ موجود ہوں۔
 (جیسے حنفی۔ شافعی وغیرہ کے مختلف فیہ مسائل) ان میں سے کسی ایک جانب کو اگر امیر یا
 خلیفہ متعین کر کے لوگوں کو اس پر عمل کرنے کا حکم دے تو ان کا فرض ہوگا کہ اس کا اتباع کریں۔
 اگرچہ حیثیت حنفیت یا شافعییت اس کے مذہب کے خلاف ہو۔ (صفحہ ۲۲)

امید ہے اہل حدیث بھی اسے تسلیم کر لیں گے!

(۴) تشکیل پاکستان کے فوری بعد ہم نے لکھا تھا کہ ہندوستان سے جو مسلمان ادھر آ رہے ہیں وہ کوئی
 نہ کوئی ایسا ہنر جانتے ہیں جس سے وہ (وسائل میسر آجائے) کے بعد، اپنی روٹی کما لینے کے قابل ہو جائیں گے۔ لیکن
 ایک طبقہ ایسا ہے جو کوئی ہنر نہیں جانتا اور دوسروں کی کمائی پر زندگی بسر کرتا ہے۔ یہ ہے ہمارے مذہبی
 پیشواؤں کا طبقہ جو مجرم کر کے ادھر آ رہا ہے۔ ان کا بسیرا پرستش گاہوں میں ممکن تھا لیکن مشکل یہ ہے کہ۔
 غیر مسلموں کی متروکہ پرستش گاہیں۔ (مندر۔ گر جے۔ گوردوارے) انہیں الاٹ نہیں کئے جاسکتے۔ اور مساجد میں
 پہلے سے امام اور مؤذن موجود ہیں۔ لہذا ان کی روزمی کا مسئلہ مشکل پیدا کر دے گا۔ ہم نے حکومت سے
 کہا تھا کہ وہ ان کی کفالت کا ذمہ لے لے اور آئندہ اس قسم کے بے ہنر افراد پیدا نہ ہونے دے۔ اگر ایسا
 نہ کیا گیا تو یہ بے ہنر، بے کار افراد حصولِ رزق کیلئے نفعیہ کی طرح اختیار کریں؟ اس سے ملک کو عجیب قسم
 کی نازک مشکلات کا سامنا کرنا پڑ جائے گا۔

ہماری اس بات پر کسی نے کان نہ دھرا، اور اس کا جو نتیجہ نکلا وہ ہم سب کے سامنے ہے۔ پاکستان
 کا مشکل ترین مسئلہ یہی بن گیا ہے!

محدث نے ہماری ہم نوائی میں لکھا ہے کہ

اور ہم یہ سمجھتے ہیں کہ فردی اختلاف کو ہوا دینے والا علمائے سوء کا وہ گردہ ہے جس
 کا روزگار ان مسائل سے وابستہ ہے۔ اگر علماء اور ائمہ مساجد کی کفالت کی ذمہ داری حکومت
 لے لے، جس طرح سعودی عرب میں ہے، تو یہ تفرقہ و انتشار کی فضا بہت کم کی جاسکتی ہے۔

(صفحہ ۲۲-۲۳)

ان حضرات کی یہ خاص ٹیکنیک ہے کہ جب ان حضرات سے علماء کی خرابیوں کا اعتراف کئے بغیر نہیں پڑتی
 تو کہہ دیتے کہ یہ علماء سوء کی خرابیاں ہیں، لیکن کبھی یہ نہیں بتاتے کہ یہ "علماء سوء" کون کون سے ہیں۔ ان
 میں سے ہر شخص اپنے ان کے علماء کو علماء حق قرار دیتا ہے اور دوسروں کے علماء کو علماء سوء۔

محدث کا ارشاد ہے کہ یہ مساب ان علماء سوء کا ہے جن کا روزگار ان مسائل سے وابستہ ہے۔ کیا ہم
 اپنے معاصر سے یہ پوچھ سکتے ہیں کہ علماء حق کے روزگار کا ذریعہ کیا ہے؟ یہ جو ہوائی جہازوں میں ساری دنیا کا
 چکر لگاتے اور پانچ پانچ سٹار ہوٹلوں میں مہینوں قیام فرماتے ہیں، ان کا ذریعہ معاش کیا ہے؟

دوسری بات یہ ہے کہ موجودہ علماء سود اور ائمہ مساجد کی کفالت کا ذمہ حکومت لے بھی لے، تو اس انبوہ عظیم کی کفالت کیسے ہو سکے گی جو ہر سال سیلاب کی طرح، مکتبوں اور دارالعلوموں سے برآمد ہوتا رہتا ہے؟ اگر ہمارے ان اعداد و شمار بڑھتے تو دیکھنے والے دیکھتے کہ ملک کے دفاع پر شاید اتنا خرچ نہیں ہو رہا جتنا خرچ اس طبقہ پر ہو رہا ہے جو ملک کی پیداوار میں ایک پائی کا بھی اضافہ نہیں کرتا۔ اس ملک کی معیشت کبھی سنبھل نہیں سکتی جس میں حجم غفیر ان لوگوں کا بوجھن کا ملک کی پیداوار میں کچھ حصہ نہ ہو۔ اور جو دوسروں کی کمائی پر مرفہ الحاقی کی زندگی بسر کرتے ہوں۔ اور پھر یہ بھی حقیقت ہے کہ جنہیں کچھ کام کئے بغیر، مفت کی روٹی ملتی ہو، ان کا مشغلہ اس کے سوا کیا رہ جاتا ہے جو انہیں لے کر ہٹا کر

کارِ مِلّٰہ فی سبیل اللہ فساد!

سیاسی پارٹیاں

محدث نے یہ بھی لکھا ہے کہ ملک میں سیاسی پارٹیاں نہیں ہونی چاہئیں کیونکہ ان سے انشقاق اور انتشار پھیلتا ہے۔ لیکن ایسا لکھنے وقت اس کے سامنے مذہبی فرقے بھی تھے (جنہیں وہ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے لعنت قرار دے چکا ہے)۔ اس باب میں اس کی کش مکش دیکھ کے قابل ہے۔ لکھا ہے:-

سیاسی جماعتوں کے وجود کے جواز میں یہ دلیل بھی پیش کی جاتی ہے کہ اگر فقہی اختلاف، یا مذہبی فرقوں کا وجود برداشت کر لیا گیا ہے تو آخر سیاسی اختلاف اور سیاسی جماعتوں کے وجود کو کیوں نابالغ سمجھا جاتا ہے؟ ہم یہ عرض کریں گے کہ فقہی اختلاف سے مراد قرآن و سنت کی تعبیر کا اختلاف ہے۔ قرآن و سنت کے علاوہ کچھ نہیں لیکن اس اختلاف میں بھی جب غصبت پیدا ہو جائے اور فرقہ پرستی تک فطرت پہنچ جائے تو یہ بھی کفر ہے۔ پھر ایک غلط بات کو جائز قرار دے کر اس کو دوسری غلط چیز کے لئے بنیاد قرار دے دینا کہاں تک درست ہے؟ سیاسی اختلاف ہونا ایک فطری بات ہے لیکن اس اختلاف کو عقیدہ کا رنگ دینا پھر اپنے ہم خیال لوگوں کا منظم ہونا اور پھر حصول اقتدار کے لئے کوشش کرنا اور پھر اسے درست سمجھنا اور اس پر اٹھ کر رہنا ایک گمراہ کن امر ہے۔

مذہبی فرقوں اور سیاسی فرقوں میں دو سرافرق یہ ہے کہ مذہبی قائدین نے کبھی اپنے قیاس و مسلک کو قابل اتباع قرار نہیں دیا کہ اس عقیدہ کو لوگ اپنا فرقہ بنائیں اور اگر لوگ بنالیں تو تو ان کی اپنی غلطی ہے جس سے قائد بزار ہوتے ہیں۔ جبکہ سیاسی جماعتوں میں ایسی تنظیم بنانا لازمی شرط ہے۔ اور ان قائدین کا یہی مقصد ہوتا ہے۔

اور تیسرا فرقہ یہ ہے کہ مذہبی فرقوں کا مقصد عوام کی اکثریت کو اپنے ساتھ ملانا اور اقتدار پر قبضہ یا اس کے حصول کی کوشش کرنا نہیں ہوتا جبکہ سیاسی جماعتوں کا اصل مقصد وہی ہوتا ہے

کہ ملک میں اپنی اکثریت پیدا کرنے کے لئے نشست و انتشار پیدا کیا جائے اور پھر اس راستہ سے حکومت میں سے حصہ رسی حاصل کرنے کے لئے راستہ ہموار کیا جائے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اس بوکھلاہٹ پر کوئی تبصرو نہ کرنا ہی مخدوں تو ہیں تبصرہ ہے۔ آپ نے دیکھا کہ اپنے غلط مسلک کو صحیح ثابت کرنے کے لئے انسان کس قسم کی لاطائل باتیں کرنے لگ جاتا ہے۔

(۱)

اجماع امت

ہمارے ہاں کسی عقیدہ، قانون یا مسلک کے "اسلامی ہونے کی ایک دلیل یہ بھی دی جاتی ہے کہ امت کا اس پر اجماع ہے۔ یہ تو اتر سے ثابت ہے۔ سلف صالحین کا مسلک یہی ہے۔ وغیرہ۔ محدث اس باب میں لکھتا ہے: اجماع صحابہؓ کے حجت ہونے میں تو کسی کو کلام نہیں، لیکن مابعد کے امداد کا اجماع کا حجت ہونا بذات خود مختلف فیہ مسئلہ ہے۔ اور راجح قول یہی ہے کہ مابعد کا اجماع امت کے لئے قابل حجت نہیں۔

صحابہؓ کا اجماع تو ثابت کیا جاسکتا ہے کیونکہ ان کا زمانہ بھی محدود اور علاقہ بھی محدود تھا۔ لیکن مابعد کا اجماع ثابت کرنا بھی بہت مشکل ہے جبکہ امت اقصائے عالم میں پھیل چکی ہے اور علماء بھی ہر جگہ موجود ہیں۔ (ص ۱۹۲)

مابعد کے اختلافات کو تو چھوڑ بیٹے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی (مرحوم) نے ایک کتاب لکھی ہے جس کا عنوان ہے "الانصاف فی بیان سبب الاختلاف" اس کا حال ہی اردو ترجمہ "فقہی اختلافات کی اصلیت" کے نام سے، علماء اکیڈمی، محکمہ اوقاف پنجاب کی طرف سے شائع ہوا ہے۔ اس کے پہلے باب کا موضوع ہے: فروعات میں صحابہؓ اور تابعینؓ کے اختلافات کے اسباب کا بیان۔

اس میں شاہ صاحب (مرحوم) نے صحابہؓ کے اکثر اختلافات کا ذکر کیا ہے، اور لکھا ہے:

اندریں حالات صحابہؓ کے درمیان جو اختلاف کا آغاز ہوتا ہے اس کی چند بنیادیں تھیں۔ (ص ۱)

اور پھر ان "بنیادوں" کی وضاحت کرنے کے بعد لکھا ہے:

الفرض صحابہؓ کرامؓ کے مذاہب مختلف ہوتے، وہ ان میں سے تابعین نے جس میں سہولت دیکھی اختیار کر لیا۔ (ص ۱۴)

لہذا، اجماع تو (ان تحقیقات کی روش سے) صحابہؓ میں بھی نہیں تھا۔ اس لئے محدثانہ اس "اجماع" کو سند کس طرح قرار دے سکتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ اہل حدیث حضرات مابعد کے اجماع یا امت کے تواتر اور اس کے سواد اعظم ہونے کو اس لئے سند تسلیم نہیں کرتے کہ وہ اس میں کوئی دینی سبق دیکھتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ امت کی اکثریت ہمیشہ اہل فقہ کی رہی ہے۔ انہی کے مسلک کو امت کا اجماع، یا تواتر، یا سواد اعظم کا مسلک کہا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اہل حدیث حضرات اسے سند تسلیم کر ہی نہیں سکتے۔

یاد رکھیے! دین میں سند صرف کتاب اللہ کی ہے۔ جب تک اُمت اس مرکز پر نہیں آئے گی اس کے اختلافات رفع نہیں ہو سکیں گے۔

(۰)

آہ بیچاری عورت!

یہ تو نہیں ہو سکتا کہ یہ حضرات "اسلامی نظام" کی بابت کہیں اور عورت کو فحاشی کر دیں، چنانچہ محدث نے اس موضوع پر تفصیل سے لکھا ہے اور (حسب معمول) اس جنس مظلوم کو خوب خوب رگسید رہے۔ فرماتے ہیں:-

اسلام مساوات مرد و زن کا ہرگز قائل نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے عورت کی شہادت کو مکمل نہیں بلکہ نصف قرار دیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:-

.....وَأَسْتَشْهِدُوا شَهِيدَيْنِ مِنْ الرِّجَالِ كَمَا فِي الْقُرْآنِ لَكُمْ يَكُونَا جَلِيلَيْنِ فَتَرْجُلُ
وَأَمَّا أَنْتِ فَيَسْتَنْتِزِعُونَ مِنَ الْمَشْهَدِ آخِ..... (۲۸۲)

اور اپنے میں سے دو مردوں کو گواہ بنالیا کرو۔ اور اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں جن کو تم گواہ بنانا پسند کرو۔

صرف یہی نہیں بلکہ میراث میں بھی عورت کا حصہ مرد سے نصف ہے۔ اور عبادت میں بھی عورت، مرد کے برابر نہیں۔ حیض و نفاس کے ایام میں عورت سے نماز ساقط ہو جاتی ہے۔ انہی وجوہ کی بنا پر رسول اللہ ﷺ نے عورت کو "ناقص العقل والدین" کہا ہے۔

اور امارت و سیاست کے معاملات میں تو عورت کی شمولیت کو اسلام نے ہرگز پسند نہیں کیا۔ نہ ہی خلفائے راشدینؓ کے انتخاب میں عورت کے ووٹ کی کوئی مثال ملتی ہے۔ (ص ۳۱۱)

اس کے بعد مختلف دوائیہ جیات کا ذکر کرنے کے بعد، ملخصاً کہا ہے کہ عورت کا دائرہ کار صرف گھر کی چار دیواری ہے۔ قرآن کریم کی طرف تو ہم بعد میں آئیں گے۔ پہلے ایک دلچسپ تقابلی ملاحظہ فرمائیے۔ کہا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے عورت کو "ناقص العقل والدین" قرار دیا ہے۔ یعنی عقل اور دین دونوں میں ناقص۔ لیکن وہی ورق بھر رسول اللہ کی دو احادیث نقل کی ہیں، جن میں سے ایک یہ:-
رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے تم پر ماؤں کی نافرمانی کو حرام کیا ہے۔

اور دوسری میں یہ کہ

ماؤں کے قدموں میں جنت ہے۔ (ص ۳۱۱)

یعنی جس عورت کو رسول اللہ ﷺ نے دین اور عقل دونوں میں ناقص قرار دیا ہے، اسی عورت کے متعلق ارشاد ہے کہ اس کی نافرمانی کو خدا نے حرام قرار دیا ہے۔ آپ اندازہ فرمائیے کہ عقل اور دین دونوں میں ناقص جنس جس قسم کے احکام دے گی، وہ عقل اور دین کے اعتبار سے کس قسم کے ہوں گے، اور جو قوم اس قسم کے احکام کی نافرمانی کو

(جیکم خداوندی) حرام سمجھے گی، اس کا مقام کیا ہوگا؟ اتنا ہی نہیں۔ اس ناقص العقل والدین کے متعلق فرمایا کہ اس کے قدموں میں جنت ہے! ان حضرات کے پیش کردہ اور صحیح قرار دادہ، ان ارشادات نبویؐ کی زد سے جو نوگ جنت میں جانے کے مستحق قرار پائیں گے ان کی عقل اور دین کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے!

اب آئیے قرآن کریم کی طرف! یہ حضرات اول تو قرآن کریم کی طرف آتے ہی نہیں۔ اور اگر انہیں اپنی مصلحت کی بنا پر مجبوراً اپنا پڑتا ہے تو اس میں کھلے بندوں تحریف کرتے ہیں۔ اس آیت کو لیجئے جس کی بنا پر انہوں نے ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عورت کی شہادت کو مرد کے مقابل میں نصف قرار دیا ہے۔ انہوں نے جو آیت (۲۸۲) درج کی ہے وہ پوری آیت نہیں۔ انہوں نے اس کا اگلا حصہ حذف کر دیا ہے۔ اس بقیہ حصہ کے ساتھ آیت یوں ہے:-

وَأَشْهِدُوا شَهِيدَيْنِ مِنْ رِجَالِكُمْ فَإِنْ لَمْ يَكُونَا جِدِیْنِ فَرَجُلٍ وَ
مَرَأَتٍ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشَّاهِدِیْنَ أَنْ تَضِلَّ إِحْدَاهُمَا فَتُذَكِّرَ إِحْدَاهُمَا
الْأُخْرَىٰ ۚ..... (۲۸۲)

شیخ الہند مولانا محمد الحسنؒ اس کا ترجمہ یوں کرتے ہیں:-

اور گواہ کرو دو شاہد اپنے مردوں میں سے۔ پھر اگر نہ ہوں دو مرد، تو ایک مرد اور دو عورتیں، ان لوگوں میں سے جن کو تم پسند کرتے ہو گواہوں میں تاکہ اگر بھول جائے ان میں سے ایک تو یاد دلا دے اس کو دوسری۔

آپ قرآن کریم کی حکمت بالغہ پر غور کیجئے۔ اس نے صرف اتنا ہی نہیں کہا کہ اگر دو مرد نہ ملیں تو ایک مرد اور دو عورتیں بطور گواہ بلاؤ۔ اس نے اس کے ساتھ یہ بھی واضح کر دیا کہ یہ دوسری عورت کس مقصد کے لئے بلائی جائے گی؟ صرف اس مقصد کے لئے کہ اگر وہ گواہ (عورت) کہیں بھول جائے تو یہ دوسری عورت اسے یاد دلا دے۔ اس سے واضح ہے کہ

(۱) پہلی عورت اگر کہیں بھول جائے تو دوسری عورت کا صرف اتنا فریضہ ہوگا کہ وہ اسے یاد دلا دے! اور جس — یہ نہیں کہا کہ اس کی جگہ یہ شہادت دینے لگ جائے۔

(۲) اگر پہلی عورت غلطی نہ کرے، تو دوسری عورت کا کوئی (FUNCTION) ہی نہیں ہوگا۔

(۳) قرآن کریم نے کہیں نہیں کہا کہ پہلی عورت کی گواہی دینے کے بعد، دوسری عورت بھی گواہی دے، اور اس طرح دو عورتوں کی گواہی مل کر ایک مرد کے برابر ہو جائے۔

ان سے پوچھئے کہ خدا نے کہا، عورت کی شہادت کو مرد کی شہادت سے نصف قرار دیا ہے، غور کیجئے کہ یہ قرآن میں کھلی ہوئی تحریف ہے یا نہیں؟

اگرچہ اس نقطہ کا تعلق موضوع زیر نظر سے نہیں، لیکن ہم (ضمناً) یہ بھی واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ قرآن کریم نے اس دوسری عورت کی ضرورت کیوں قرار دی ہے۔ نزول قرآن کریم کے وقت، عربوں نے اپنے معاشرہ میں عورت کی جو حالت بنا رکھی تھی اس کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ

أَوَمَنْ يُنَشِّئُوا فِي الْجَنَّةِ مَثَلًا لِّالْخَصَامِ عَيْدِمْ مَبْنِيَّةً (۳۸)

زبورات میں پل ہوتی اور کیفیت یہ کہ خود اپنے کیس (معاملہ) کو بھی واضح طور پر بیان کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتی۔

اس قسم کی پردریش یافتہ عورت تو ایک طرف، آپ ہمارے زمانے کی کسی ٹیڑھی لکھی خاتون خانہ کو سہلی بار کچھ ہی میں لے جائے اور پھر دیکھئے کہ اجنبی مردوں کے نجوم، اور کلا کے سوالات کی بوچھاڑ میں اس کی قنالت کیا ہوتی ہے؟ قرآن کریم نے جو کہا ہے: **أَنْ تَصْنَعَ لِحَدِّ هَذَا** تو صلت کے معنی بھول جانا ہی نہیں (CONFUSE) ہو جانا بھی ہے۔ ایسے ماحول میں اس نووارد خاتون کا (CONFUSE) ہو جانا عین ممکنات میں سے ہے۔ قرآن نے اس کی اس نفسیاتی کیفیت کے لئے بطور مدد و ایہ تجویز کیا کہ عدالت کے کٹہرے میں، اس کی کوئی جاننے پہچاننے والی عورت (اس کی کوئی سہلی) اس کے ساتھ کھڑی رہے۔ اس سے اس کے اوسان بجا رہیں گے۔ اور اسے اس کا اعتماد ہوگا کہ اگر اس سے کہیں کوئی تسامح ہو جائے گا تو اس کی ہم دوش اسے یاد دلادے گی۔ یہ تھا قرآن کریم کا مقصد گواہ عورت کے ساتھ، اس کی ہم دوش کی موجودگی سے!

واضح رہے کہ قرآن کریم نے یہ کیفیت، اس ماحول میں پردریش پانے والی عورتوں کی بتائی ہے۔ یہ کہیں نہیں کہا کہ عورت، عورت ہونے کی جہت سے ناقص العقل ہوتی ہے۔ ان کی مناسب تعلیم و تربیت سے وہ زندگی کے ہر گوشے میں مردوں کے ہم دوش چلنے کے قابل ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ قرآن کریم نے، ہر شعبہ حیات میں مومن مردوں اور مومن عورتوں کے ہم قدم چلنے کا ذکر کیا ہے۔ تفصیل کے لئے پرویز صاحب کی کتاب طاہرہ کے نام خطوط دیکھئے (۲) محدث نے یہ بھی لکھا ہے کہ میراث میں بھی عورت کا حصہ مرد سے نصف ہے۔ ان حضرات کی مشکل یہ ہے کہ تو، دس دس سال کے عرصہ دراز میں جس نصاب تعلیم کے ختم ہونے پر انہیں عالم ہونے کی سند عطا ہوتی ہے، اس نصاب میں قرآن شامل نہیں ہوتا۔ سال آخر میں، صرف سورۃ البقرہ کی تفسیر تبراگڑھا دی جاتی ہے۔ اگر قرآن مجید ان کی تعلیم میں شامل ہوتا تو یہ اس قسم کی غیر ذمہ دارانہ باتیں نہ کہتے کہ میراث میں بھی عورت کا حصہ مرد سے نصف ہے۔ ہم پوچھتے ہیں اپنے اس مناصر سے کہ کیا قرآن کریم کے یہ احکام بھی کہیں ان کی نظر و سہ سے گزرے ہیں کہ

(۱) وَلَا تَوْرِيهِ زَكَاةً وَلَا أُخْرٰی وَاحِدٌ مِّنْهُمَا الشَّدَاةُ مِمَّا تَدْرٰی (۳۹)

متوفی کے ترکہ میں، اس کی ماں اور باپ میں سے ہر ایک کا چھٹا حصہ ہے۔

اس میں عورت (ماں) کا حصہ مرد (باپ) کے برابر ہے۔ نصف نہیں۔

(۲) کلا کہ ترکہ کی تقسیم کے متعلق فرمایا کہ

..... وَلَهُ أَخٌ أَوْ أُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا الشَّدَاةُ ج (۴۰)

اس کے بہن اور بھائی دونوں میں سے ہر ایک کا چھٹا حصہ ہے۔

اس میں عورت (بہن) کا حصہ مرد (بھائی) کے برابر ہے۔ نصف نہیں۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ محدث کا بیان کردہ کلیہ کہ میراث میں عورت کا حصہ مرد سے نصف

ہے۔ غلط ہے۔ قرآن میں جہاں لڑکی کا حصہ لڑکے سے نصف کہا گیا ہے، وہ لڑکی کے عورت ہونے کی جہت سے نہیں۔ اس کے مصالح اور ہیں جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں۔

(۳) محدث نے یہ بھی کہا ہے کہ

امارت اور سیاست کے معاملات میں تو عورت کی شمولیت کو اسلام نے

ہرگز پسند نہیں کیا۔ (ص ۱۳)

قرآن کریم میں سیاست و امارت (یعنی امور مملکت) کے سلسلہ میں ہے:-

الَّذِينَ إِذَا مَكَتْهُمْ فِي الْأَمْْرِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَآمَرُوا
بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ (۲۲)

یہ (مومنین) وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم نے انہیں ملک میں حکومت عطا کی تو یہ اقامتِ صلوٰۃ، ایتائے زکوٰۃ، امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کریں گے۔

اس سے واضح ہے کہ اسلامی حکومت کا فریضہ اقامتِ صلوٰۃ، ایتائے زکوٰۃ، امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے۔ سوال یہ ہے کہ قرآن کریم نے اس فریضہ حکومت کو مردوں کے لئے مختص اور محدود کیا ہے یا اس میں عورتوں کو بھی شریک کیا گیا ہے۔ سورۃ التوبہ میں ہے:-

وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ
وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ (۹)

مومن مرد اور مومن عورتیں، ایک دوسرے کے دوست اور بھی خواہ ہیں۔ ان کا فریضہ اقامتِ صلوٰۃ، ایتائے زکوٰۃ، امر بالمعروف و نہی عن المنکر ہے۔

آپ دیکھتے کہ، جن امور کو اسلامی حکومت کا فریضہ قرار دیا گیا ہے، ان میں مردوں اور عورتوں دونوں کو یکساں شریک کیا گیا ہے۔ غور کیجئے کہ یہ حضرات کس طرح اسلام کے نام پر خلافِ قرآن تعلیم پیش کرتے ہیں!

(۱۰)

رحیم کی سزا

محدث نے لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ کے دورِ خلافت میں جب حضرت معاذ بن جبل بطور سفیر رومی دربار میں گئے تو دورانِ گفتگو بات بادشاہ کے اختیارات کے متعلق چھڑ گئی۔ آپؓ نے ان سے فرمایا:-
تم کو اس پر ناز ہے کہ تم ایسے شاہنشاہ کی رعایا ہو جس کو تمہاری جان و مال کا اختیار ہے۔
لیکن ہم نے جس کو اپنا بادشاہ بنا رکھا ہے وہ کسی بات میں اپنے کو ترجیح نہیں دے سکتا۔ اگر وہ ناکرے تو اس کو درے لگائے جائیں (ص ۱۶۶)

ظاہر ہے کہ خلیفۃ المسلمین حضرت عمرؓ (جن کے متعلق بات ہو رہی تھی) شادی شدہ تھے۔ اگر شادی شدہ

زانی کی سزا رجم تھی تو حضرت معاذ کو یہ کہنا چاہیے! انہوں نے دُروں کی سزا بتائی۔ اس سے ظاہر ہے کہ اس زمانے میں شادی شدہ زانی کی سزا کوڑے تھی۔ رجم نہیں تھی۔

(۰)

اسلام اسی کا نام نہیں!

محدث نے مباشرتی مساوات کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ حضرت عمرؓ جب کسی کو عامل مقرر کرتے تو ان سے مندرجہ ذیل باتوں کا عہد لیا جاتا تھا:-

(۱) ترکی گھوڑے پر سوار نہیں ہوگا۔

(۲) باریک کپڑے نہ پہنے گا۔

(۳) چھٹا ہوا آٹا نہ کھائے گا۔

(۴) دربان نہ رکھے گا۔۔۔۔۔ اہل حاجت کے لئے دروازے ہمیشہ کھلے رکھے گا۔

ایک بار حضرت عمرؓ بازار میں پھر رہے تھے۔ ایک طرف سے آواز آئی کہ عمرؓ! کیا عالموں کے لئے چند قواعد مقرر کر دینے سے تم عذاب الہی سے بچ جاؤ گے؟ تم کو یہ خبر ہے کہ عیاض بن غنمؓ جو مصر کا عامل ہے باریک کپڑے پہنتا ہے اور دروازے پر دربان مقرر ہے۔

اس کے بعد لکھا ہے:-

حضرت عمرؓ نے (حضرت) عیاضؓ کو مدینہ بلوایا۔ ان کا باریک کرتہ اتروا کر کھل کا کرتہ پہنایا اور بکریوں کا ایک گلہ منگوا کر حکم دیا کہ جنگل میں جا کر چراؤ۔ (ص ۱۶۲)

کس قدر صحیح کہا تھا اس کہنے والے نے کہ "اے عمرؓ! تم عالموں کے لئے چند قواعد مقرر کر دینے سے خدا کے عذاب سے نہیں بچ سکتے۔" اسلام۔۔۔ قواعد مقرر کر دینے اور چند قوانین نافذ کر دینے کا نام نہیں یہ تو تکریم آدمیت اور مساواتِ انسانیہ کے عملی نظام کا نام ہے۔ اس میں جو عامل، کھل کا کرتہ پہن کر بکریاں چرانے نہیں جانتا، امور مملکت میں شرکت کا اہل نہیں ہو سکتا۔ اور جو سربراہ مملکت، سر بازار اس قسم کی تنقید، خندہ پیشانی سے نہیں سن سکتا، اور اس پر عمل کرے اور کرا نہیں سکتا، وہ مستحقِ خلافت نہیں قرار پا سکتا۔

(۰)

خط و کتابت کرتے وقت اپنے خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں تاکہ خریدار صاحبان! جواب میں تاخیر نہ ہو۔ جواب طلب امور کے لئے جوابی لفافہ لکھیں اور پچھنے کی صورت میں ہر ماہ کی ۵ تاریخ سے پہلے اطلاع دیں۔ (ناظم ادارہ)

(۰)